۹۷-۱۹۹۶ کا بجٹ ---- چند قابلِ غور پہلو

پروفیسر خورشید احمد

بے نظیر بھٹو نے اپنا تیسرا بجٹ اسمبلی میں پیش کر دیا ہے' اور ازراہ تفنن اسے "غریب آدمی کا بجٹ" (poor man's budget) قرار دیا ہے۔ حالانکہ پاکستان کی تاریخ میں اس سے زیادہ "غریب کش" بجٹ پیش نہیں ہوا۔ انھوں نے' اور ان کے وزیر مملکت برائے خزانہ نے پچھلے دو بجٹوں کی طرح اس دفعہ بھی ماضی کی حکومتوں پر بھرپور تبرا کیا ہے' اور سابق وزیراعظم کے "ترکہ" کا اس طرح نوحہ کیا ہے جیسے وہ اس سال برسراقتدار آئی ہوں' حالانکہ اب ان کو اقتدار میں آئے پونے تین سال ہونے کو آرہے ہیں۔ اگر کسی کے "ترکہ" نے معیشت کا حال تباہ کر رکھا ہے تو وہ خود ان کے سہ سالہ اقتدار کی غلط پالیسیوں' بد انتظامیوں اور شاہ خرچیوں کا ترکہ ہے جس کا انھیں کسی دوسرے کو دوش دینے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے۔

۵۰۰ بلین روپے کے اس بجٹ میں ۲۲۰ بلین کا خسارہ ہے جسے بڑی عاقبت ناشناسی سے پورا کیا جا رہا ہے یعنی ۱۰۳ بلین بیرونی قرضوں کے ذریعہ' ۵۰ بلین کے قریب سرمایہ پر مبنی آمدنی اور نج کاری کی آمدنی کے ذریعے' ۲۰ بلین خسارہ کی سرمایہ کاری کے ذریعے اور ۴۱ بلین نئے ٹیکس لگا کر۔ بجٹ کا یہ فریم ورک من و عن وہی ہے جس پر گذشتہ ۲۵ سال سے بجٹ سازی ہو رہی ہے' اور جس کا نتیجہ ہے کہ آج سود اور قرضہ کی ادائیگی میں قرض / آمدنی کا ۴۰ فیصدی صرف ہو رہا ہے اور قرضوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ حقیقی ترقیاتی اخراجات کا تناسب برابر کم ہو رہا ہے اور نظام معیشت میں کوئی ایسی تبدیلی رونما نہیں ہو رہی ہے جو ملک کے غریب عوام کی قسمت کو بدلنے کا ذریعہ بنے۔ ہم روز بروز غربت' بیرونی ممالک کی محتاجی' خود کفالت سے دوری' اور عالمی منڈیوں میں مسابقت کے قابل نہ رہنے کی دلدل میں پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ اس خطرناک روش پر چلنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند سال میں ملک تقریباً دیوالیہ ہو جائے اور بجٹ آمدنی کا بڑا حصہ صرف قرض ادا کرنے کی نذر ہو جائے۔

سال رواں (۹۶-۱۹۹۵) میں معیشت کی رفتار ترقی میں بظاہر اضافہ ہوا ہے اور قومی پیداوار میں ۶.۱ فی صد کا اضافہ بتایا گیا ہے۔ لیکن اس کی بڑی وجہ زراعت میں ۷ فی صد کی ترقی ہے جو دراصل کپاس کی اچھی فصل (۱۰ ملین گانٹھ) اور گندم کی وافر پیداوار (۱۹ ملین ٹن) کی رہین منت ہے۔ جہاں تک صنعتی پیداوار کا تعلق ہے بڑی صنعتوں کی پیداوار میں صرف ۳ فی صد اضافہ ہوا ہے برآمدات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا، اور تجارت میں خسارہ مزید بڑھ گیا ہے۔ درآمدات ۵.۱۱ بلین ڈالر رہی ہیں جب کہ برآمدات متوقع ۱۰ بلین ڈالر کے مقابلے میں صرف ۸ بلین ڈالر۔ اس طرح پاکستان کو تاریخ کے سب سے بڑے تجارتی خسارے، یعنی ۵.۳ بلین ڈالر کا سامنا ہے، جو تباہ کن ہے، اور جس کے اثرات مبادلہ خارجہ کے ذخائر پر بھی سخت منفی ہیں۔ قرضوں کا بوجھ اس کے علاوہ ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق بیرونی قرضوں کا بوجھ اب ۵۶ بلین ڈالر سے متجاوز ہے۔ ملکی قرضے بھی ۷۰۰ بلین روپے ہیں، (ہفت روزہ Politics and Business، ۱۱ جون ۹۶، ص ۱۲)۔ اس کے ساتھ افراط زر کا مسئلہ ہے جس نے عام آدمی کی کمر توڑ دی ہے۔ بجٹ میں ۱۰ فی صد افراط زر کا دعویٰ کیا گیا ہے جب کہ حقیقی افراط زر ۲۰ فی صد سے کسی طرح کم نہیں ہے اور نئے بالواسطہ ٹیکسوں سے اس میں مزید اضافہ ہو گا۔

بجٹ کا سب سے مایوس کن پہلو یہ ہے کہ قرضوں کے بوجھ سے نجات پانے کی کوئی اسٹرے ٹیجی وضع نہیں کی گئی ہے بلکہ جو آمدنی سرمایہ کاری اور نج کاری سے حاصل ہو رہی ہے وہ بھی قرضوں کا بوجھ اتارنے کے بجائے جاری بجٹ کو پورا کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ یہ قدم اثاثوں کا ایسا غلط استعمال ہے جسے بجا طور پر غداری کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود انحصاری کمیشن کی رپورٹ نے نج کاری کی آمدنی کو صرف قرضوں کی واپسی کے لیے مختص کرنے کی سفارش کی تھی۔ یہی مطالبہ سینیٹ کی فنانس کمیٹی نے اپنی دو رپورٹوں میں کیا ہے۔ حکومت کے نمایندوں نے اس پر عمل درآمد کی یقین دہانی بھی کروائی تھی مگر عملاً اس طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی ہے۔

ملک میں جس انداز میں آزاد معیشت اور آزاد تجارت کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ صریح تباہی کا راستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درآمدات بڑھ رہی ہیں، برآمدات uncompetitive ہونے کی وجہ سے بڑھ نہیں پا رہیں۔ صنعتیں بند پڑی ہیں اور پیداواری صلاحیت (capacity) سے ۴۰ فی صد کم پر کام کر رہی ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے جس بیرونی سرمایہ کاری کی خوش خبریاں سنائی جا رہی ہیں، اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ معاشی بنیادی ڈھانچہ (infrastructure) ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور بد سے بدتر ہو رہا ہے۔ افراط زر بڑھ رہا ہے اور حکومت اور اس کے حواری ہیں کہ چین کی بنسری بجا رہے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ملک کا بنکاری نظام شدید بحران سے دوچار ہے۔ ۴۰ فی صد قرضے غیر متحرک ہیں۔ ۱۷ سے ۲۴ فی صد شرح سود (mark up) پر بھی بنک مشکلات سے دوچار ہیں۔ بنک کے قرضوں کا ۴۹ فی صد حکومت اور اس کے ادارے لے رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں پرائیویٹ سرمایہ کاری مشکلات سے دوچار ہے اور بنک سرمایہ کاری کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ٹیکس چوری ' رشوت اور بدعنوانی کا یہ حال ہے کہ ملکی وسائل کا کم ازکم ۳۰ سے ۴۰ فی صد ان کی نذر ہو رہا ہے۔ رشوت اور چوری کی قیمت کا محتاط اندازہ تقریباً ۲۰۰ ارب روپے سالانہ ہے۔

ایک طرف ملک کی معیشت کی یہ حالت ہے اور دوسری طرف حکمرانوں کا یہ حال ہے کہ بڑے زمینداروں پر ابھی کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا اور حکومت کے کارپردازوں کی دلچسپی صرف اپنی ذاتی مراعات کے حصول اور قوم کو لوٹنے میں نظر آتی ہے جس کی بدترین مثال خود صدر اور وزیراعظم کو دی جانے والی مراعات اور ان پر خرچ کی جانے والی رقوم ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت قائداعظم محمد علی جناح اور پورے ایوان صدارت پر صرف ۲۰ ہزار روپے سالانہ خرچ ہوتا تھا جبکہ سال رواں میں صرف ایوان صدر پر ایک ارب روپے اور وزیراعظم کے ایوان پر ۸۰۰ ملین روپے خرچ ہوئے ہیں۔ گویا صرف سربراہان مملکت اور حکومت پر تقریباً دو بلین روپے سالانہ خرچ ہو رہے ہیں۔ اگر اس کا مقابلہ اس رقم سے کیا جائے جو مرکزی بجٹ سے پورے ملک کے تین کروڑ نوجوانوں کی تعلیم پر خرچ ہو رہے ہیں تو یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ پورا فیڈرل تعلیمی بجٹ صرف ۸۷ . ۳ بلین روپے ہے جبکہ ان دو سرکاری گھرانوں پر پورے تعلیمی بجٹ کا ۵ . ۴۶ فی صدی خرچ ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر پورے تعلیمی بجٹ میں تقریباً ۵۰ فی صدی اضافہ ہو سکتا ہے اگر یہ دو سفید ہاتھی قابو میں لائے جا سکیں۔ اگر ان اخراجات کا موازنہ ملک کے فیڈرل بجٹ برائے صحت سے کیا جائے تو اور بھی ہولناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ قوم کی صحت پر کل سالانہ خرچہ ۸۳ ۳ . ۱ بلین روپے ہے یعنی ان دو سفید ہاتھیوں پر ملک کے صحت کے پورے بجٹ سے بھی ۳۰ فی صد زیادہ خرچ کیا جا رہا ہے اور اس پر دعوے ہیں غریب نوازی کے ' اور وزیراعظم صاحبہ اسے غریب آدمی کا بجٹ کہہ رہی ہیں۔

ملک میں بجٹ سازی کا ایک اور بڑا ہی پریشان کن پہلو ہماری معیشت اور ہماری سیاست پر آئی ایم ایف (IMF) کی بالادستی ہے۔ بجٹ میں ملک کی معیشت کو صحیح خطوط پر استوار کرنے سے کہیں زیادہ دلچسپی اس امر سے لی گئی ہے کہ آئی ایم ایف کو کیسے مطمئن کیا جائے۔ اس کی سب سے اندوہ ناک مثال حکومت کے معاشی مشیر وی اے جعفری کا وہ مشورہ ہے جو انھوں نے کراچی میں ملک کی تاجر اور صنعت کار برادری کو دیا۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ برآمد کی جانے والی اشیا کو جنرل سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ کرنا ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ گو تاجر برادری کے دلائل میں بڑا وزن ہے لیکن حکومت

مجبور ہے۔ اس لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ تاجروں کا ایک وفد آئی ایم ایف کے ذمہ داروں سے ملے اور ان کو مطمئن کرے۔ اگر وہ مطمئن ہو گئے تو پالیسی میں تبدیلی ممکن ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ — اس سے زیادہ کسی قوم کی ذلت اور کیا ہوگی اور اس سے زیادہ ان کی آزادی اور خود مختاری کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ حکومت کا معاشی مشیر تاجروں کو مشورہ دے کہ اپنی حکومت کے بجائے بلاواسطہ آئی ایم ایف سے بات کریں! سوال یہ ہے کہ پھر حکومت کی ضرورت کیا ہے۔ کیوں نہ ملک کی معاشی پالیسی کا ٹھیکہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کو دے دیا جائے۔ کم از کم آئی ایم ایف کو باگ ڈور دینے سے تو بہتر ہو گا کہ اپنے تاجروں کو یہ کام سونپا جائے۔

اس صورت حال کے اس کے سوا اور کیا معنی ہیں کہ اس بدقسمت ملک کے ارباب اقتدار نے واشنگٹن کی بالادستی کو قبول کر لیا ہے اور حال یہ ہے کہ

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
انھی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات ان کی

ان حالات میں یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ اس بجٹ کو ایک اسلامی ملک کا بجٹ سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی اعتبار سے بجٹ کا کوئی ایسا پہلو ہمارے سامنے نہیں آ سکا جس سے دور و نزدیک یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ ایک اسلامی فلاحی ملک کا بجٹ ہے اور اس کا تعلق اس قوم سے ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے برپا کی گئی ہے، جو انصاف کے قیام کی ذمہ دار ہے، جو غربت، افلاس اور مجبوری کو ختم کرنے کی داعی ہے اور جس کا اصل امتیاز ہی یہ تھا کہ اس کی قلم رو میں نہ کوئی بھوکا ہوتا تھا اور نہ بے سہارا، جس میں زکوٰۃ دینے والے تو ہوتے ہیں مگر زکوٰۃ لینے والا نہ پائے جاتے ہوں۔ اور جو اپنے وسائل کو حق کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر کو مٹانے کے لیے استعمال کرنے پر مامور ہے۔ ایک طرف امت مسلمہ پاکستان کے نظریاتی اور ملی اہداف ہیں اور دوسری طرف ارباب اختیار کی غفلت، بے وفائی اور بدانتظامی، اور یہ بجٹ اس زبوں حالی کا آئینہ دار ہے ؎

آئین چمن بندی بھی نہیں، دستور نوا سنجی بھی نہیں
اب اس سے زیادہ گلشن کا شیرازہ پریشان کیا ہو گا

خطوط مودودی" دوم پر پروفیسر خورشید احمد کے تبصرے کی تیسری اور آخری قسط آیندہ کسی شمارے میں پیش کی جائے گی۔